احمد ندیم قاسمی

ولادت: ۱۹۱۶ء

وفات: ۲۰۰۶ء

احمد ندیم قاسمی کا اصل نام احمد شاہ تھا۔ وہ تحصیل خوشاب کے قصبہ انگہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پیر غلام نبی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے میں حاصل کی اور صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ شادی کے بعد انھوں نے محکمہ آبکاری میں بطور سب انسپکٹر ملازمت کا آغاز کیا۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ ایک بلند پایہ شاعر، منفرد افسانہ نگار، ممتاز صحافی اور عمدہ نقاد تھے۔ ندیم کی شخصیت پر ان کے چچا خان بہادر حیدر شاہ کا گہرا اثر تھا۔ ان کے چچا علامہ اقبالؒ کے ہم سبق تھے۔ اس طرح ندیم کو شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ندیم نے صحافت میں بھی دلچسپی لی انھوں نے کئی ادبی رسائل شائع کیے جن میں پھول، تعلیم نسواں، نقوش، سحر، فنون اور روزنامہ امروز شامل ہیں۔ بلکہ فنون تو ان کی شخصیت کی پہچان بن گیا۔ وہ ”حرف وحکایت“ کے نام سے اخبارات میں فکاہیہ کالم بھی لکھتے رہے۔

ندیم کا پہلا افسانہ ”بدنصیب بت تراش“ ہے۔ ندیم کی تحریر سادہ اور رواں ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع دیہات کے رہنے والے عام لوگوں کے مسائل اور جذبات ہیں۔ محبت کا جذبہ ایک کائناتی حقیقت ہے۔ دیہات کے لوگ جو محنتی، جفاکش اور زندگی کی بہت سی سہولیات سے محروم ہوتے ہیں لیکن محبت کا جذبہ ان کے ہاں بھی کارفرما ہوتا ہے اور یہی حقیقت ندیم کا موضوع ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقی زندگی کا عکس ملتا ہے۔

اگرچہ ندیم کی زیادہ تر توجہ افسانہ نگاری پر رہی اور انھوں نے افسانے تواتر سے لکھے ہیں لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری میں ایک طرف کلاسیکی سج دھج ہے تو دوسری طرف جدید انداز و آہنگ بھی موجود ہے۔ ان کی شاعری میں عصری آگہی کا شعور ملتا ہے۔ ان کی بعض نظمیں موسیقیت کے حوالے سے بڑی پُر اثر ہیں۔ اُنھوں نے نظم اور غزل، دونوں کہیں ہیں اور دونوں میں

اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تاہم اُن کی پہچان غزل کے حوالے سے ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ”دشتِ وفا“ پر انھیں آدم جی ایوارڈ بھی ملا ہے۔

مجموعہ ہائے کلام (نثر): چوپال، بگولے، طلوع و غروب، گرداب، آنچل، سیلاب، آبلے، در و دیوار، سناٹا، بازارِ حیات، برگِ حنا، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، نیلا پتھر (افسانے)۔

مجموعہ ہائے کلام (شاعری): دھڑکنیں، رم جھم، شعلۂ گل، دشتِ وفا، محیط، دوام اور لوحِ خاک، بسیط وغیرہ۔

احمد ندیم قاسمی

مائیں

محلے والوں کو ایک دن ایسا بھی یاد نہ تھا جب راجا صاحب اور خواجہ صاحب کی بیویوں میں تُو تکار نہ ہوئی ہو۔ جس روز اس تُو تکار میں دیر ہوجاتی تو وہمی قسم کے لوگ ڈر کے مارے بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگتے کہ ٹوٹ نہ پڑے۔ دونوں بیگمات کے درمیان جھگڑا نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے صبح کا وقت ہوجائے اور سورج نہ نکلے۔

راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے گھر متصل تھے۔ ایک کی دیوار میں کیل گاڑی جاتی تھی تو دوسرے کی دیوار کا پلستر اکھڑ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک روز دوبارہ جھگڑا ہوگیا۔ معمول کا جھگڑا تو دوپہر کو ہی ہوچکا تھا مگر پھر شام کو ہلکا سا زلزلہ آگیا اور بیگم راجہ یہ سمجھیں کہ بیگم خواجہ نے ملحقہ کمرے میں پلنگ گھسیٹا ہے۔ جھپٹ کر کھڑکی میں منہ ڈالا اور بیگم خواجہ کو وہ بے نقط سنائیں کہ وہ بے چاری زلزلے کو بھی بھول گئیں۔ پھر جب شوہروں نے اپنی اپنی بیگم سے کہا کہ آیۃ الکرسی پڑھو، زلزلہ آرہا ہے، تو جب جا کر بیگم راجہ سارا قصہ سمجھیں۔ وہیں دھب سے بیٹھ گئیں کہ انھوں نے سنا تھا زلزلے میں اَرَوئی لڑکھڑا جائے اور گر پڑے تو اسے مرگی کا مرض ہوجاتا ہے۔ اس وقت بیگم خواجہ نے جھینپی اور ڈری ہوئی بیگم راجہ کو ایسی نفرت سے دیکھا جیسے وہ ان پر تھوکنا چاہتی ہے مگر بے بس ہیں کہ منہ حلق تک خشک ہوچکا ہے۔

نہ تو راجہ صاحب سے بیگم خواجہ اور نہ ہی خواجہ صاحب سے بیگم راجہ پردہ کرتی تھیں۔

کئی بار ایسا ہوا کہ راجہ صاحب شیو بنانے بیٹھے تو بلیڈ ختم پا کر اٹھے اور کھڑکی میں جا کر پکارے ''خواجہ صاحب! ایک بلیڈ عنایت کردیجیے۔'' اور یہ بلیڈ بیگم خواجہ نے راجہ صاحب تک پہنچایا۔ اسی طرح کئی بار خواجہ صاحب کو بوٹ پالش یا گرم پانی کی بوتل درکار ہوئی اور انھوں نے راجہ صاحب کو پکارا تو بیگم راجہ نے

مطلوبہ چیز خواجہ صاحب کے حوالے کی۔ اس کے باوجود اپنے اپنے گھروں کے اندر شوہروں کی موجودگی میں بھی بیگمات ایسے زناٹے سے جھگڑتیں کہ بات ''میں تجھے اپنی ان آنکھوں سے بیوہ ہوتے دیکھوں'' تک جا پہنچتی۔ مگر پھر کچھ دیر کے بعد راجہ صاحب کھڑکی میں جا کر پکارتے: ''کیوں خواجہ صاحب! واک کو چلیے گا؟'' اور خواجہ صاحب کسی پرلے کمرے سے جواب دیتے ''ضرور چلیں گے۔ میں حاضر ہوا۔'' اور پھر محلے والے، جو کچھ دیر پہلے بیگم راجہ اور بیگم خواجہ کی لڑائی سن چکے تھے، دیکھتے کہ راجہ صاحب اور خواجہ صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی بات پر ہنستے جارہے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے لیے ان بیگموں کی لڑائی معمول بن چکی ہے اور جس طرح وہ چھان بورا خریدنے والے سے یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ یوں چنگھاڑ کر آواز نہ لگایا کرو، اسی طرح بیگمات کے جھگڑے میں مداخلت کو بھی بے کار سمجھتے ہیں۔ ایک بار محلے کے ایک بزرگ نے دونوں کو روک کر کہا تھا ''' آپ بھلے لوگ ہیں اپنی بیگمات کو لڑائی جھگڑے سے روکیے، پورا محلّہ بدنام ہورہا ہے۔'' اس پر راجہ صاحب نے نہایت ادب سے کہا تھا ''یہ عورتوں کا معاملہ ہے۔ ہم آپ ان کے معاملے میں دخل دیں گے تو اچھے نہیں لگیں گے۔ آپ اگر اپنی بیگم صاحبہ کو ان کے پاس بھیج کر انھیں سمجھا سکیں تو سبحان اللہ، ورنہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ اکٹھے رکھے ہوئے دو برتن بھی ٹکرا کر بج اٹھتے ہیں تو یہ دونوں تو ماشاء اللہ جیتی جاگتی عورتیں ہیں'' اور خواجہ صاحب نے فوراً کہا تھا ''جیتی جاگتی اور بولتی چالتی عورتیں۔'' اس پر دونوں ہنس پڑے تھے اور محلے کے بزرگ بھی اپنی مسکراہٹ پھیلانے میں ناکام ہوکر بچے کی طرح شرما کر پلٹ گئے تھے۔ جب دونوں بیگمات جھگڑتی تھیں تو ان کی باتوں میں الزام تراشی بہت کم اور بددعائیں بہت زیادہ ہوتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ محلے والوں کو جھگڑے کا زیادہ لطف نہیں آتا تھا۔ مردوں نے تو سرے سے دلچسپی لینا ہی چھوڑ دی تھی۔ البتہ عورتیں بیگم راجہ یا بیگم خواجہ کی پہلی ہی آواز پر لپک کر چھتوں پر چڑھ جاتیں یا کھڑکیوں میں سے آدھی آدھی باہر نکل آتیں مگر جب جھگڑا ختم ہوتا تو یوں اداس چہرے لیے پلٹتیں جیسے سونے کی تلاش میں پہاڑ کھود کر خالی ہاتھ آرہی ہوں۔ اُنھیں یہ سوچ کر بہت دکھ ہوتا تھا

کہ نہ تو بیگم راجہ نے بیگم خواجہ کے کسی آشنا کی نشاندہی کی ہے اور نہ بیگم خواجہ نے بیگم راجہ کو کوئی اخلاق سوز * طعنہ دیا ہے۔ یہ سمجھیے کہ محلے کی عورتوں کو یہ جھگڑا مجبوراً سننا پڑتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے مریض بے نمک مرچ کا کھانا کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

یہ جھگڑا جس طرح بے وجہ شروع ہوتا تھا اُسی طرح بے وجہ ختم بھی ہوجاتا تھا۔ مثلاً بیگم راجہ کے بیٹے کی گیند اچھل کر کھڑکی میں سے گزری اور بیگم خواجہ کی بالٹی میں جاگری۔ اب بیگم راجہ چیخ رہی ہیں کہ بیگم خواجہ نے جان بوجھ کر گیند بھگودی کہ گیلی مٹی سے بھر جائے اور مٹی سے بچے کے ہاتھ بھر جائیں اور ہاتھوں سے وہ اپنے کپڑے خراب کرلے اور بیگم راجہ کو پھر سے کپڑے دھونے پڑیں اور صابن الگ خرچ ہو اور وقت الگ ضائع ہو۔ ادھر بیگم خواجہ کا اصرار ہوتا تھا کہ گیند بچے نے نہیں، بیگم راجہ نے پھینکی ہے اور تاک کر بالٹی ہی میں پھینکی ہے کیونکہ نل بند ہوچکا تھا اور اب پینے کے پانی کے لیے بہشتی سے ایک مشک کے لیے کہا جائے جو غضب خدا کا ایک مشک کے پورے دو آنے لیتا ہے۔

بات بڑھتے بڑھتے اس انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔ ''اللہ کرے تیرا بچہ مرجائے''۔

''میرا بچہ خدا کا مال ہے، پر اللہ کرے پہلے تیرا بچہ مرے کہ میں اپنی آنکھوں سے تجھے اپنے یہ چڑیلوں جیسے بال نوچتے دیکھوں۔''

''میں کبھی کھڑکی میں سے کود کر آؤں گی اور تیری زبان پر انگار رکھ دوں گی۔''

''اس سے پہلے میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی؟''

''ٹانگیں ٹوٹیں تیری اور تیرے ہوتوں سوتوں کی۔''

پھر دونوں ایک دوسری کو گھور کے دیکھتیں۔ پھر دونوں غصے سے رونے لگتیں اور کچھ دیر کے بعد ...ں اپنے گھر کے کاموں میں مصروف ہوجاتیں۔

جھگڑے کا آغاز عموماً بیگم راجہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ بیگم خواجہ کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ جیسے اس ... کے انتظار میں ہوتی تھیں۔ انھوں نے ایک بار بھی بیگم راجہ کو نظر انداز نہ کیا۔

...ی ضرورتوں کے تحت تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔

مگر ایک روز یہ عجیب واقعہ ہوا کہ بیگم خواجہ آنکھوں میں خون اُتارے کھڑکی میں آئیں اور بولیں

''اے بیگم صاحبہ! ذرا سامنے تو آ۔''

بیگم راجہ خم ٹھونک کر میدان میں اُتریں اور حسب معمول جھگڑے کا آغاز کرنے ہی لگی تھیں کہ بیگم خواجہ نے آغاز کردیا۔ وہ بولیں ''تیرے لڑکے نے آج میرے لال کی ران میں پنسل ماری ہے۔ باریک سکہ اس کے چڑے میں گھس گیا ہے اور وہ رو رو کر اپنی جان ہلکان کیے دے رہا ہے میں اگر اس کے بدلے میں تیرے لونڈے کے پیٹ میں چاقو گاڑ دوں، پھر؟

''پھر یہی کہ میں تیرا کلیجہ کچا چبالوں گی۔'' بیگم راجہ نے جواب دیا۔

''غضب خدا کا''۔ بیگم خواجہ بگڑیں۔ ''میں کہتی ہوں تیرے لڑکے نے میرے لال کو زخمی کردیا ہے اور انصاف دیکھو لوگو! کہتی ہے میں تیرا کلیجہ چبالوں گی''۔

''اری تو میرے بیٹے کے پیٹ میں چاقو گاڑے گی تو پھر میں تیرا کلیجہ نہیں چبالوں گی تو کیا تیری دعوت کروں گی؟'' بیگم راجہ کڑکیں ''پر تیرا بیٹا ہے کہاں، ذرا دکھاؤ تو سہی اسے کوئی خراش بھی آئی ہے کہ تو عادت پوری کرنے کو بک جھک رہی ہے۔''

یکایک بیگم خواجہ پلٹیں اور پرلے کمرے سے اپنے بچے کو اٹھا کر کھڑکی میں بٹھادیا۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سُجالی تھیں پھر بیگم خواجہ نے اس کی ران پر سے پاجامہ ہٹایا اور بولیں ''لے دیکھ لے اپنی منحوس آنکھوں سے۔''

''آنکھیں تو منحوس ہوں گی تیرے باپ دادا کی''۔ بیگم راجہ نے کہا اور پھر کھڑکی کے پاس آکر بولیں۔ ''پر ذرا دیکھوں تو''۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ دم بخود ہوکر رہ گئیں۔ ایک لمحہ یونہی چپ چاپ کھڑی رہیں، پھر انگلی سے بچے کی ران کے اس مقام کو چھوا جہاں سے نکیلی پنسل نے جلد ادھیڑ دی تھی۔ خون رس کر جم گیا تھا اور آس پاس سرخی کا دائرہ سا بن گیا تھا۔ بچہ انگلی کے مس سے بلبلا اٹھا تو بیگم راجہ نے دونوں ہاتھ بڑھا بیگم خواجہ کے

بچے کو اٹھا لیا اور اسے اپنے کولھے پر بٹھا کر تھپکنے لگیں اور رونے لگیں اور کہنے لگیں "آگ لگے ان ہاتھوں کو جنھوں نے تیرے پھول سے جسم کو ادھیڑا ہے۔ آنے دے کوشہ کو۔ تیرے سامنے ایسی ماردوں گی ایسی ماردوں گی کہ طبیعت ہری ہوجائے گی۔" پھر وہ بیگم خواجہ کے بیٹے کے آنسو پونچھنے لگیں اور اسے چومنے لگیں۔ "تو جگ جگ جیے، تو سہرے باندھے۔ میں تو کہتی ہوں تو خواجہ خضر کی عمر پائے، بس اللہ کرے تیری ماں مرجائے۔"

یہ کہہ کر بیگم خواجہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں اور اپنے مرنے کی بددعا سن کر آنسوؤں میں مسکرانے لگی تھیں۔

اتنے میں بیگم راجہ کا بیٹا آگیا۔ اسے دیکھتے ہی بیگم راجہ اس پر جھپٹیں اور اکٹھے چار پانچ تھپڑ اس زناٹے کے مارے کہ بچے کی چیخیں پورے محلے میں گونج گئیں۔ پھر وہ باورچی خانے سے ایک لکڑی اٹھا لائیں اور بولیں "تو نے اس بچے کو ایک زخم دیا ہے، آج میں تجھے ایسے ہی ایک سو زخم دوں گی تاکہ تجھے عمر بھر یاد رہے کہ دوسروں کے جسم میں بھی جان ہوتی ہے"۔

بیگم راجہ کا بیٹا ماں کے تیور اور لکڑی دیکھ کر چیخا، اور پھر کھڑکی میں سے بیگم خواجہ گرجیں "یہ لکڑی رکھ دے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"کیوں؟" بیگم خواجہ کی یہ مداخلت بہت بری لگی "تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی؟ میں اسے ضرور سزا دوں گی۔" پھر وہ اپنے بچے کے پاس جا کر کڑکیں "پھر مارے گا کسی کو؟" اور جواب سننے سے پہلے انھوں نے لکڑی بچے کے پیٹ پر دے ماری۔

اچانک بیگم خواجہ کھڑکی میں سے کود کے آئیں اور بیگم راجہ کے بلکتے ہوئے بیٹے کو سینے سے لگا کر ایک طرف کھڑی ہوگئیں "کون سا غضب آگیا آخر۔ ذرا سی پنسل ہی تو لگی ہے۔"

"یہ ذرا سی پنسل ہے؟" بیگم راجہ نے بیگم خواجہ کے بیٹے کی ران پر سے پاجامہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر زخم کی بڑھتی ہوئی سرخی دیکھ کر وہ روتی ہوئی بچے سے لپٹ گئیں اور اسے سینے سے لگا کر اٹھ کھڑی

ہوئیں۔

آمنے سامنے کھڑی بیگموں کو یکایک احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بچوں کو سینے سے چمٹائے رو رہی ہیں۔ اس صورت حال کا انکشاف ان پر ایک ساتھ ہوا، کیونکہ دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگیں۔ پھر بیگم خواجہ ہنسی روک کر بولیں۔

"ہائے ہم بھی کیسی پاگل ہیں!"

"پاگل ہوگی تو۔" بیگم راجہ بولیں اور ساتھ ہی زور کا قہقہہ مارا۔ بیگم خواجہ نے اس قہقہے کا ساتھ دیا۔ پھر دونوں ایک دم رک گئیں کیونکہ دونوں بچے اپنی ماؤں کو ہنستا دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگے تھے۔

(کپاس کا پھول)

مشق

۱۔ سبق کے مطابق درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) دونوں بیگمات کے برعکس اُن کے شوہروں کے تعلقات کیسے تھے؟

(ب) لڑائی کا آغاز عموماً کس کی طرف سے ہوتا تھا؟ بیگم راجہ یہ جھگڑا شروع کرتی

(ج) زلزلہ آنے پر بیگم راجہ کا کیا ردِعمل تھا؟ آیت الکرسی پڑھتی تھی۔

(د) محلّے کے بزرگ کے سمجھانے پر راجہ صاحب کا کیا جواب تھا؟

(ہ) پانی کی بالٹی میں گیند گرنے پر دونوں بیگمات کا کیا مُوقف تھا؟

(و) بچے کا زخم دیکھ کر بیگم راجہ نے کیا ردِعمل ظاہر کیا؟

۲۔ "شاید یہی وجہ تھی کہ محلّے والوں کو جھگڑے کا زیادہ لطف نہیں آتا تھا" اس جملے میں ایک مخصوص ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ وضاحت کریں۔